ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE: 2789-8784

ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com

ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.3 (2024)
(July to September)

معاصر اُردو افسانے میں صارفی رُجحانات کا مطالعہ

A Study of Consumerism in Contemporary Urdu Short Story

رضوانہ بی بی

پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، سرحد یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور

Rizwana Bibi

Doctoral Candidate, Department of Urdu, SUIT, Peshawar

rizwanaphd839@gmail.com

Abstract:

Consumerism is a legacy of the corporate era that has impacted not just individuals but society as a whole. The fast movement of science and technology has crushed old social values. Social values have completely changed now a days. Urdu short story has always reflected both the tradition of social values and the changes within them. The negative effects of consumerism on society have been specifically addressed in Urdu short story, aiming to inform readers about the implications of consumerism. This paper presents a study of consumer society in the works of selected contemporary Urdu short story writers.

Keywords: Consumerism, science, technology, social values, Urdu short story, implications, contemporary

صارفیت کارپوریٹ عہد کی دین ہے جس نے فرد واحد پر ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی برق رفتار گاڑی نے پرانی معاشرتی اقدار کو اپنے پہیوں تلے کچل ڈالا ہے۔ معاشرتی اقدار مکمل طور پر بدل گئی ہیں۔ اردو افسانے نے ہمیشہ معاشرتی اقدار کی روایت کے ساتھ ساتھ تغیر کی بھی عکاسی کی ہے۔ صارفیت نے معاشرے پر جو منفی اثرات مرتب کیے ہیں ان کو اردو افسانے میں خاص طور موضوع بنایا گیا ہے جس کا مقصد قاری کو صارفیت کے مضمرات سے آگاہ کرنا ہے۔ مقالہ ہذا میں منتخب معاصر اردو افسانہ نگاروں کے افسانوں میں صارفی معاشرت کا مطالعہ مقصود ہے۔ صارفیت کا لفظ "صرف" سے مشتق ہے جس کے معانی کسی چیز کو استعمال میں لانے کے ہیں۔ صارفیت سے مراد کسی شے کا غیر مشروط استعمال ہے۔ صارفیت اشیاء و خدمات کی ایسی خریداری کا عمل ہے جس میں ان اشیاء و خدمات کی طلب اور خریداری کی شرح ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے۔ صارفیت کی بدولت صنعتی انقلاب آیا جس کے تحت سب سے پہلے وقت اور پھر افرادی قوت کی بچت کا خیال پیشِ نظر تھا۔ صنعتی انقلاب کا دوسرا مقصد فلاحِ آدم کے لیے اشیاء و خدمات کی فراہمی تھا۔ اس مد میں سب سے پہلے کپڑے کی صنعت نے میکانکی فروغ حاصل کیا، پھر کوئلے کی صنعت نے ترقی پائی، ذرائع آمد و رفت نے جدید صورت پائی، ذرائع مواصلات میں اضافہ ہوا اور یہ سب کاریگری مشین کی تھی جسے مجموعی طور پر صنعتی انقلاب کہا گیا۔ جب اشیاء و خدمات کی پیداوار میں اضافہ ہوا تو تجارت کی راہیں ہموار ہونے لگیں۔ ایک جگہ پیدا ہونے والی شے اپنا خریدار تلاشنے دوسری جگہ کی عازمِ سفر ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ وہاں کی ثقافت، رسوم و رواج، معاشرتی رویے اور رجحانات بھی سفر کرنے لگے اور یہیں سے صنعت نے عالمگیری روابط کی بناڈالی۔ ایک مخصوص وقت تک صنعتی انقلاب نے انسانی ضرورتوں کو بہ طریقِ

احسن پور اکیا لیکن پھر ایک وقت آیا کہ اشیاء و خدمات کی پیداوار عام انسانی ضرورت سے زائد ہونے لگی۔ اب انسان کو شے کی تلاش نہیں بلکہ شے کو انسان (صارف) کی تلاش رہنے لگی۔ صنعتی پیداوار کو صارف کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس ضرورت کو "کھپت" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ "صارفیت" دراصل "کھپت" کا ردعمل ہے۔ صنعتیں اپنی پیداوار کی کھپت کے لیے اشیاء و خدمات کی تشہیر کرتی ہیں جن کے نتیجے میں صارف خریداری پر مائل ہوتا ہے۔ صارفیت کے اس بڑھتے رجحان کو اب افسانوں میں بھی واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ صارفیت نے ادب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ صارفیت نے نہ صرف ادب کی اشاعت و ترویج پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں بلکہ بجائے خود ادب کے موضوعات کا حصہ بن گئی ہے۔ جدید افسانے میں صارفی معاشرے کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے۔

اُردو افسانے کے اوائل نمونوں میں معاشرے میں سادگی کا عنصر نمایاں ہے۔ سادہ طرزِ زندگی میں خالص جذبات کی عکاسی افسانے کا حاصل ٹھہرتی تھی۔ رفتہ رفتہ زندگی کے انداز میں جدت آتی گئی اور حقیقی زندگی کے ساتھ ساتھ افسانوی زندگی کے رنگ بھی بدلنے لگے۔ صارفی رجحان کی جھلک افسانوں میں بھی نظر آنے لگی۔ صارفی معاشرے کی ایک مثال محمد حمید شاہد کے افسانہ "کوئٹہ میں کچلاک" میں مذکور کوئٹہ شہر کی ایم اے جناح روڈ کی اس صورت حال سے لگایا جاسکتا ہے:

"اس ایک روڈ پر اکتالیس سے زیادہ بنک تھے، بھرپور بزنس کمانے والے بنک۔"(۱)

بینکوں کی یہ بھرمار صارفی رجحان کی مظہر ہے۔ بینک معیشت کا اہم رکن ہیں۔ معیشت کی اہمیت واثرات کو انفرادی، خاندان، رشتہ دار، معاشرہ، ریاست اور ملک غرض ہر جگہ واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ انسانی تاریخ کے اندر جتنی جنگیں اور لڑائیاں ہوئیں ان میں اکثریت کے پیچھے وجہ پیسے کی ہوس ہی رہی ہے۔ تاریخ میں شاید کوئی شاذونادر ہی ایسی جنگ یا لڑائی ہوئی ہو جس کے پیچھے مقصد پیسہ نہ ہو۔ بہت کم ہی کوئی جنگ یا لڑائی ایسی ہے جو کسی نظریہ کی بنیاد پر لڑی گئی ہو۔ درحقیقت ان نظریات کے پیچھے کسی مال و دولت کا بنیادی اور اہم کردار کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔ یہی حقیقت عام زندگی میں میں کارفرما ہے۔ پیسے کی ریل پیل سے مسابقت نے جنم لیا اور معاشرے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی تگ و دو عام ہونے لگی۔ ماہرین کا یہ خیال ہے کہ اکیسویں صدی کی صارفیت کا ایک غالب عنصر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش ہے اور معاشرے میں ہر طرف اس کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ غریب، امیر کی نقالی کرتے ہیں اور امیر، معروف شخصیات کی، یہی وجہ ہے کہ اشیا کی فروخت اور ان کی بڑے پیمانے پر تشہیر کے لیے معروف شخصیات ہی کا استعمال کیا جاتا ہے، جن میں خصوصیت کے ساتھ فلمی ستارے اور کرکٹ کھلاڑی شامل ہیں۔ ایک مشاہدے کے مطابق ماضی قریب میں ہمارے ہاں شاپنگ مال انتہائی کم تھے لیکن دن بدن ان کی تعداد میں اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ یہی حال رہائشی مکانات کا بھی ہے۔ اس ضمن میں حامد سراج کے افسانے "سیاہ کار" میں صارفی رجحان کی جھلک دیکھیں:

"یہ ایک نو تعمیر شدہ آبادی ہے۔ زمین پر کنکریٹ، سیمنٹ اور اینٹوں سے مکان اگ آئے ہیں۔ زمین کے کئی قطعے خالی ہیں۔ ایک پلاٹ کے کنارے ابھی ایک ٹرک مٹی اتار گیا ہے۔ پچھلی گلی میں جو ایک نامکمل مکان ہے وہاں ایک چوکیدار سنا ہے دھندا کرتا ہے۔۔۔۔ ایک پلاٹ کی بیسمنٹ کے لیے کھدائی ہو رہی ہے۔ ایک مشین مٹی کھود کھود کر ایک طرف ڈھیر کرتی جا رہی ہے۔ یہ لاکھوں کے پلاٹ اور کروڑوں روپے کے مکانات ہیں۔ رات اترتی ہے تو نو تعمیر شدہ مکانوں میں قمقمے جلتے نظر آتے ہیں۔ دن میں

فیشن ایبل خواتین اپنی تعمیر دیکھنے کے لیے اکثر چکر لگاتی ہیں۔ ان کے چہرے مہرے سے عمارت ٹپکتی ہے۔ یہ جو مکان اگ آئے ہیں ان میں نسل نسل کے لوگ آباد ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد کون لوگ تھے انہیں اس سے غرض نہیں۔ انہیں یہ بھی درد سر نہیں کہ دولت کہاں سے آئی۔ بیگمات اور بچے اس بات پر خوش ہیں کہ زمین پر ان کے حصے کا مکان اگ آیا ہے۔۔"(۲)

اس حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح دھڑا دھڑ مکانات تعمیر ہو رہے ہیں۔ دراصل صارفیت خود بخود ایک شے کے استعمال اور ضرورت کا جواز پیدا کر لیتی ہے۔ صارفیت کی حیرت انگیز ترقی کا ایک اور سبب یہ ہے کہ اشیا کو ہر فرد کے لیے قابل استعمال بنانے کی کافی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ ہر شے تک، ہر فرد کی رسائی کو ممکن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمتی کاروں کی خریداری ہو یا گھر کی تعمیر، سودی قرض کی فراہمی آسان ہے۔ آج ہم صارف معاشرہ کہلاتے ہیں جو چیزوں کا خریدار تو ہے موجد نہیں۔ اس کی ابتدا صنعتی انقلاب سے ہوئی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صنعتی انقلاب درحقیقت صنعتی انقلاب نہ تھا، بلکہ یہ صارف انقلاب تھا۔ صارفیت اب عوام کی روزمرہ خواہشات میں بھی نظر آنے لگی ہے۔ حامد سراج کے افسانے "پانچ روپے کا متروک نوٹ" میں ایسی ہی خواہشات کا سیلِ رواں پھوٹ بہا ہے:

"۳۳ انچ کا LCD TV بھی اس کا خواب تھا۔ نیا فریج اور سپلٹ اے سی تو وہ پسند کر آئی تھی۔ AC کے بغیر گرمیاں کاٹنا عذاب ہوتا ہے۔"(۳)

درج بالا حوالے میں جدید مشینوں کے سہارے وقت کاٹنا بڑھتی ہوئی صارفیت کا ایک واضح اظہار ہے۔ چونکہ صارفیت سے مراد کسی چیز کو استعمال میں لانا ہے اس لیے نت نئی مشینری خود بخود اپنا مصرف نکال لیتی ہے۔ آج ایجادات اور تخلیقات کے پیش نظر انسانی ضرورتوں کو تخلیق کیا جاتا ہے۔ گویا آج میڈیا اور صارفی نظام باہم ہیں اور ایک دوسرے کا مکمل تعاون کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی مار کیٹوں میں مشتہر اشیا کے ضمن میں حامد سراج کے افسانہ "ہے کوئی" سے صارفی معاشرت کے مقابل استدلال کا رویہ ملاحظہ ہو:

"اسے رزقِ حلال کمانے اور کھانے کی تعلیم ماں نے گھٹی میں دی تھی۔ وہ بڑی بڑی مار کیٹیں، چمکتی دمکتی دکانیں، صرافہ بازار سے گزرتے ہوئے سونے کی چمک دمک، نئے ماڈل کی ایک سے ایک کار دیکھ کر سوچتا کیا یہ اکلِ حلال سے ممکن ہے؟ دولت کہاں سے آ رہی ہے۔۔؟ کالا دھن کیسے سفید ہوتا ہے؟ لاینحل سوالات اسے الجھا کر رکھ دیتے اور وہ پھر اپنی ڈگر پر چل نکلتا۔"(۴)

ظاہر ہے جب اشیاء کی اس قدر فراوانی ہو گی تو یہ سوال تو خود بخود ذہن میں جگہ بنائے گا کہ اتنی دولت کہاں سے آ رہی ہے۔ لیکن صارفیت کو ان سوال و جواب سے کوئی غرض نہیں۔ بس اعلیٰ برانڈ تک رسائی ہی ایک عام آدمی کا مقصد حیات ہے۔ صارفی عہد میں کمپنی کا نام اور پروڈکٹ کا ماڈل انسان کے مقام و مرتبے کا تعین کرتا ہے۔ حامد سراج فی زمانہ امارت کی نشانی بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"ہر شخص کی امارت کا اندازہ کار کے ماڈل سے آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔۔۔ ایک نو بیاہتا جوڑا ۱۰۰۰cc کی کار میں کرائے کا مکان تلاش کرتا پھرتا ہے۔۔ انہیں بیس ہزار میں ایک گھر پسند آگیا ہے۔۔"(۵)

درج بالا حوالے میں کار کا ماڈل صارف کی حیثیت کا تعین کرنے میں مدد ہے۔ گلوبلائزیشن کے عہد میں ہر چیز کو خریدا اور بیچا جاسکتا ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو قابل استعمال نہ ہو۔ یہ عہد صارف کی پیداوار کا عہد ہے۔ شے کی پیداوار کا عہد پرانا ہو چکا ہے۔ اس لئے آج کا مارکیٹنگ سسٹم اور میڈیا شے کی پیداوار پر زور نہیں دیتا بلکہ شے کی پیداوار سے پہلے صارف پیدا کر لئے جاتے ہیں۔ محمد حمید شاہد کے افسانہ "آدمی کا بکھراؤ" میں بدلتے ہوئے صارفی رجحان کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے:

"اس کے پاس نئے ماڈل کی ایسی کار تھی جس کے شاک بہت اچھے تھے۔ اتنے اچھے کہ کار سڑک پر بچھ کر اور جم کر چلتی تھی اور آدمی کے دھیان کو بھی جھٹکا نہیں لگتا تھا۔"(۶)

درج بالا مثال سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ فی زمانہ گاڑی ضرورت بھی ہے اور شوق بھی اور نئے ماڈل کی گاڑی تو ہر ایک کو پسند ہوتی ہے۔ پاکستانی معاشرے میں اچھی گاڑی معاشرے میں اعلیٰ مقام کی ضامن سمجھی جاتی ہے اور نئی گاڑی اس سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے بھی جو چیزیں کبھی بڑی قیمتی سمجھی جاتی تھیں اور جن کا استعمال عام آدمیوں کے لیے تصور نہیں کیا جاسکتا تھا، اب وہ ہر خاص و عام کے دسترس میں آگئی ہیں۔ جیسے ٹی وی، کمپیوٹر، ایئر کنڈیشنڈ وغیرہ۔ صارفیت کا غلبہ اس قدر ہے کہ پیشہ ور خواتین و مرد بھی اس کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور صَرف کے بڑھتے ہوئے دائرہ کار کے پیشِ نظر جنس بھی فروخت کی جانے لگی ہے۔ مبین مرزا کے افسانے "گم شدہ لوگ" میں پیشہ ور انجلی اور اس کے قدر دان رئیس کے معمولات صارفی رجحان کا واضح اظہار ہیں:

"رات کو کمرے میں واپسی مال روڈ سے ہی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ فاسٹ فوڈ سینٹر کے سامنے رک کر چائے، کافی یا بوتل پیتے، کبھی ویسے ہی چیئرنگ کراس، الفلاح، ریگل یا ہائی کورٹ کی عمارت کے سامنے کچھ دیر کے لیے ٹھہر جاتے۔۔"(۷)

صارفیت زدہ عہد میں بلند و بالا عمارات، فاسٹ فوڈ اور شاپنگ کلچر کے اثرات سے محفوظ رہ پانا آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ صارفی نظام جس منصوبہ اور پالیسی کے تحت اپنے اثرات مرتب کرتا ہے وہ انسان کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ چاہتے ہوئے بھی ہم اس کے اثرات سے خود کو بچا نہیں پاتے کیونکہ وہ صارفی نظام ہماری تہذیب اور روزمرہ کی ضرورتوں پر مسلط ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ناشتہ میں گھر پر بنائی گئی روٹی کی جگہ بریڈ اور جیم یا بٹر کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ استعمال صحت کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوتا بلکہ ہمیں یہ یقین دہانی کرادی گئی ہے کہ بریڈ، جیم یا بٹر جیسی مصنوعات ہی آسان بریک فاسٹ ہیں اور صحت کے لئے فائدہ مند ہیں۔ رفاقت حسین کے افسانے "پرچھائیں" میں فاسٹ فوڈ کی صارفیت ملاحظہ ہو:

"وہ ایک بھولی بسری عادت کو دہراتے ہوئے کیفے ٹیریا میں جا بیٹھا۔ کافی اور چکن سینڈوچ کا آرڈر دے کر وہ کیفے کی چیزوں کو مسرور نظروں سے دیکھنے لگا۔ کچھ نہیں بدلا تھا۔ ویٹروں کے سوا اور دیواروں کی رنگت کے سوا۔ ایرانی مالک بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں تھیں اور اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ کاؤنٹر والا میز پر انا تھا اور اس پر ر

کھی نذر نیازِ حسین والی صند وقچی بھی پرانی تھی۔ ایک اور لڑکا اور لڑکی دروازے سے د
اخل ہوئے اور جلدی سے بالائی منزل والی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ وہ مسکرایا اور مسکراتا
ہی رہا۔ کیفے کے دروازوں سے باہر کا منظر معمولی تبدیلی کے ساتھ وہی پرانا تھا۔ اس نے
بے سبب آہ بھرتے ہوئے سوچا۔۔ کچھ نہیں بدلا، کچھ بھی۔۔ وہ مزے سے چکن سینڈوچ
کھا رہا تھا۔"(۸)

فاسٹ فوڈ سے اتنی رغبت ظاہر کرتی ہے کہ آج کے عہد میں انسان اتنا مصروف ہو چکا ہے کہ اس کے پاس اپنی صحت پر دھیان دینے کا بھی وقت نہیں ہے۔ بس پیسے کے زور پر جو چیز جتنی مہنگی ملے وہی اچھی زندگی کی ضامن سمجھی جاتی ہے۔ انسان کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو وہاں پیسے کی اہمیت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ پیسے کا انسان، رشتوں، معاشروں، ملکوں غرض ہر شعبہ زندگی میں کلیدی کردار ہے۔ پیسے کے ہر جگہ بڑے اہم اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ تاریخ میں جھانک کر یا دور حاضر کے اندر دیکھ لیں گلوبلائزیشن کی سطح سے لے کر انسان کی زندگی تک دانستہ اور غیر دانستہ طور پر شعوری اور لاشعوری طور پر پیسے کے اثرات کسی نہ کسی صورت کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوتے ہیں۔ رفاقت حیات کے افسانے "گلاں کی سرگوشیاں" میں سے ایک صارفی خیال نقل ہے:

"نادانستہ اس نے اپنی جیب کو ٹٹولا۔ نوٹوں کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے اس نے خود کو
چاک و چوبند محسوس کیا۔"(۹)

گویا پیسہ انسان کے نفسیاتی پہلوؤں میں شامل کمیوں اور کجیوں کی تسلی و تشفی میں معاون ہے۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر دولت مند شخص اپنے اندر کشش ضرور رکھتا ہے۔ انسان کی مالی حیثیت اس کی باڈی لینگویج، گفتگو کا انداز، روزمرہ کی دلچسپیاں اور رشتوں میں واضح منعکس ہوتی ہے۔ حامد سراج کے افسانے "برائے فروخت" میں صارفی منظر نامہ ملاحظہ کریں:

"وہ چونکہ رقم دھڑا دھڑ اپنے سیف میں ڈال رہا تھا۔۔ سیف جس پر ڈیجیٹل میٹر نہ صر
ف رقم کاؤنٹ کر رہا تھا بلکہ ساتھ لگے پرنٹر پر اس کا پرنٹ آؤٹ بھی نکل رہا تھا۔ اس کے
سامنے لال، نیلے اور سبز نوٹ تھے۔ گاہکوں سے رقم لے کر automatic سیف میں
ڈالتے ہوئے اسے نوٹوں کے سوا کیا سوجھ سکتا تھا۔۔"(۱۰)

درج بالا حوالے میں ایک عام انسان کی دولت سے محبت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے اور فی زمانہ یہی رویہ کامیابی کی ضمانت ہے۔ فطری طور پر پیسے والے بندے کو ہر جگہ زیادہ اہمیت ملتی ہے۔ کسی محفل میں آپ موجود ہوں وہاں مالدار شخص آجائے تو وہ توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ اعلیٰ مکان میں رہنے والے افراد کی معاشرتی حیثیت بھی اعلیٰ ہوتی ہے۔ اس ضمن میں افسانہ "سیاہ کار" سے ایک اقتباس نقل ہے:

"کچھ نو تعمیر شدہ مکانوں پر برائے فروخت کی تختیاں آویزاں ہیں۔ سامنے چھے مرلے کا
مکان جو دو منزلہ ہے اس کی قیمت ساٹھ لاکھ روپے اور سامنے والی گلی میں دس مرلے
کا تین منزلہ ایک کروڑ سے اوپر کا ہے۔۔"(۱۱)

یعنی جس شخص کی قوتِ خرید میں جتنا مہنگا مکان ہو گا اتنی ہی اس کی عزت بھی زیادہ ہو گی۔ اسی صورتحال کو عام معاشرت سے ہٹ کر ملکی سیاست کے تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ مال دار شخصیات کا حکومتی مشینری میں بہت اثر و رسوخ ہوتا ہے۔ صوبہ، ریاست

یا شہر کی مثال لے لیں۔ جو شہر یا علاقہ مالی طور پر بہتر ہو گا اس کی وفاق میں آواز اتنی ہی بلند ہو گی۔ حکومتی بھاگ دوڑ اور دیگر معاملات میں حصہ ہو گا۔ ان مالدار شخصیات کی رائے فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس طرح آپ بین الاقوامی سطح پر چلے جائیں جن ملکوں کے پاس پیسہ ہے طاقت ہے ان کو بھرپور پروٹوکول دیا جاتا ہے۔ اس کا موازنہ اگر کسی غریب ملک سے کیا جائے تو اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ مقامی سیاست میں صارفی معاشرت کی ایک تصویر حامد سراج کے افسانے "انتظار کرو" سے ملاحظہ ہو:

> "قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبران کے گھر بھی ہمارے گھروں کے درمیان تھے لیکن ان کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ ان کے گھروں کے باہر کلاشنکوف بردار اور السیشن کتے تھے۔ وہ اپنے گھروں سے بلٹ پروف گاڑیوں میں نکلتے تھے۔ ان کی ملاقات عوام سے صرف الیکشن کے دنوں میں ہوتی تھی۔ باقی وقت وہ اونچی دیواروں میں گھرے اپنے شیشے کے محلات میں گزارتے جہاں انہوں نے اپنے تعیش کے لیے انواع و اقسام کے شغل پال رکھے تھے۔۔۔ تمام تر جدید آسائشیں، جدید ماڈل کی کاریں۔۔ ہیلی کاپٹر اور نجی جہازوں کے بعد وہ لوگ اپالو رکھنے کا سوچ رہے تھے۔ کیونکہ سب کچھ چار دیواری کے اندر تھا۔ باہر کی دنیا ان کے لیے چاند کی طرح ویرانے کی مانند تھی۔"(۱۲)

درج بالا حوالے سے ایک عام انسان جس کے پاس کم دولت ہے اور ایک سیاسی شخصیت جس کے پاس دولت کی فراوانی ہے، دونوں کے طرزِ زندگی کا فرق واضح دیکھا جا سکتا ہے۔ پھر پیسے کی فراوانی جائز آسائشات سے تعیش اور تعیش سے لغویات تک کی عادات کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ پسماندہ ممالک ترقی یافتہ ممالک کی پیروی کرتے ہیں۔ دیگر کئی خرابیوں کے ساتھ منشیات بھی ایک ایسی ہی لت ہے جو پسماندہ ممالک کے افراد نے ترقی یافتہ ممالک سے اپنائی ہے۔ شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کی بہتات کا ایک سبب ٹی وی پر دکھائے جانے والے مخرب اخلاق پروگرام اور فواحش و منکرات پر مبنی فلمیں ہیں، چوں کہ شراب نوشی اور کسی نہ کسی شکل میں نشہ خوری کے مناظر تمام فلموں میں پائے جاتے ہیں، یہی چیز نوجوانوں میں منشیات کی لت پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ بدلتے ہوئے معاشرے کی ایک اہم ضرورت کے تناظر میں رفاقت حیات کے افسانے "انڈونیشی سگریٹ" میں امپورٹڈ سگریٹ کا بیان ملاحظہ ہو:

> "بوڑھے آدمی نے بریف کیس کھولا اور ایک سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اسے دیا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ لیے۔ "رکھ لو اسے میری طرف سے تحفہ سمجھ کر۔ یہ انڈونیشی سگریٹ ہے۔ خوشبودار اور میٹھا۔ تم نے کبھی اتنا مزے دار سگریٹ نہیں پیا ہو گا"۔ وہ منحنی آواز میں آہستگی سے کہتا رہا۔ غلام رسول نے مسکراتے ہوئے پیکٹ لے لیا۔ اس نے بوڑھے آدمی کو اترنے میں مدد دی۔"(۱۳)

درج بالا حوالے سے ظاہر ہے کہ نشہ جتنا مہنگا اور اچھے برانڈ کا ہو گا اتنا ہی اچھا اور لطیف ہو گا۔ کم قیمت نشہ تلخی جبکہ بیش قیمت نشہ سرور بخشتا ہے۔ نشے کے استعمال و انتخاب میں یہ فرق صارفیت کے رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ کس درجہ افسوسناک بات ہے کہ سگریٹ سازی کی صنعت کو باقاعدہ قانونی حیثیت حاصل ہے۔ اس سگریٹ سازی کی صنعت کو روکنے یا اس کی خرید و فروخت کے حوالے سے کسی قسم کی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔ دراصل پسماندہ ممالک میں منشیات کی کاشت ترقی یافتہ ممالک کی ایما پر ہی کی

جاتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کو جہاں موقع ملتا ہے پسماندہ ممالک کا استحصال کرتے ہیں اور ان کا یہ استحصالی رویہ ہی صارفیت کے میدان میں ان کی برتری کو قائم رکھتا ہے۔ آج کے صارفی عہد میں انسان بے اطمینانی اور بے سکونی کا شکار ہے۔ انسان معاشرے میں رہتے ہوئے بھی تنہا ہے اور اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اس ضمن میں محمد حمید شاہد کے افسانے "موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ" میں ایک تنہا موت کا المیہ دیکھیے:

> "جب نخوت کا مارا امریکا اپنے پالتو اتحادیوں کے ساتھ ساری انسانیت پر چڑھ دوڑا اور اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی کے بوتے پر سب کو بد ترین اجتماعی موت کی باڑھ پر رکھے ہوئے تھا، وہ اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں چپکے سے اکیلا ہی مر گیا۔" (۱۴)

درج بالا حوالے سے مصنف یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ ایک طرف تو موت اس قدر عام ہو گئی ہے کہ امریکہ نواز پالیسیوں کے زیر اثر ہونے والی سینکڑوں اموات کی باقاعدہ تشہیر کی جاتی ہے اور میڈیا کے ذریعے ہر گلی محلے تک ان اموات کی خبر پہنچادی جاتی ہے۔ دوسری جانب انفرادی سطح پر فرد کی تنہائی اور بے بسی کا یہ عالم ہے کہ ہسپتال میں انتہائی خموشی سے مر جانے والے انسان کے سرہانے ایک رسمی آہ بھرنے کے لیے بھی کوئی زندہ شخص موجود نہیں ہوتا۔ حمید شاہد نے فرد کی موت کی بے بسی کو اپنے اکثر افسانوں میں موضوع بنایا ہے۔ مثال کے طور پر محمد حمید شاہد کے افسانے "آدمی کا بکھراؤ" میں انسان کی بے وقعتی کا عالم ملاحظہ ہو:

> "۔۔۔ٹرک کی اگلی نشست پر ایک شخص جھول رہا تھا۔ گولی اس کی گردن میں پیوست ہو گئی تھی۔ جہاں گولی کا چھید تھا وہاں سے خون دھار بنا کر بہہ رہا تھا۔ کامران نے اسے پہچاننا چاہا تو یہ دیکھ کر بوکھلا گیا کہ بری طرح مضروب شخص کوئی اور نہیں وہ خود تھا۔" (۱۵)

مذکورہ بالا افسانے کا کردار "کامران" دنیا کے تعاقب میں اس قدر مگن ہو جاتا ہے کہ اسے موت کا خیال تک نہیں آتا یہاں تک کہ موت اس تک آن پہنچتی ہے۔ موت کے آنے تک کار جہاں اس کی شخصیت میں اس قدر خرابی مچا دیتا ہے کہ اس کی تمام حسیں مر جاتی ہیں اور موت آنے تک وہ خود کی ہی پہچان کھو دیتا ہے۔ کامران کے حال کو مصنف مزید یوں بیان کرتا ہے:

> "اس کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ وہ احساس کی وہ سطح چھونے کا جھنجھٹ ہی نہ پال سکتا تھا جس میں تعلق گہرا ہو کر روحانی چھب دینے لگتا ہے۔" (۱۶)

درج بالا حوالہ اس بات کا مظہر ہے کہ عصر حاضر کی مادہ پرستی نے انسان کی روحانی اقدار کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ انسان کسی دوسرے انسان کی روحانی ضروریات تو کیا ہی پوری کرنے کے قابل ہو سکتا ہے کہ جب اسے خود اپنی محسوسات، احساسات اور روحانی ضرورتوں کا ہی ادراک نہیں۔ حمید شاہد نے اپنے افسانوں میں آج کے انسان کی اس روحانی پستی کو موضوع بنا کر قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ مبین مرزا نے بھی اپنے افسانوں میں نفسا نفسی کے اس عہد کی خوب تصویر کشی کی ہے۔ اس ذیل میں مبین مرزا کے افسانے "سفید پردہ" میں اس صارفی معاشرت میں انسان کی بے وقعتی کا ایک پہلو ملاحظہ ہو:

> "۔۔۔چار دن سے سوئے نہیں ہیں ہم، کسی ساتھی کی شکل نہیں دیکھی، ساتھی کیا کسی انسان کی شکل نہیں دیکھی، دو دن سے کھانے کو کچھ نہیں ملا، پانی بھی صبح پیا تھا آخری بار ۔ دیکھ، وہ دیکھ، ادھر خالی کین پڑا ہے، ایک بوند پانی نہیں ہے اس میں۔۔۔ موت کھیل رہی ہے ہم سے۔۔ٹریپ ہو گئے ہیں ہم۔" (۱۷)

در حقیقت مبین مرزا انسان کا آفاقی تصور ذہن میں رکھتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات کے اثرات فرد پر مرتب کرتے ہوئے فرد کی نفسیات اور اس کے احساس شکست کی روشنی میں سیاسی و سماجی افکار پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں استعمار مخالف رجحانات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں استعماری ظلم و جبر اور ان کے نافذ کردہ نظام کی بنیادی صورتوں کو فرد کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ مبین مرزا کے افسانے "خوف کے آسماں تلے" میں کراچی کی سیاسی و سماجی صورت حال کے تناظر میں فرد کی بے بسی کی تصویر ملاحظہ ہو:

> "یہاں تو کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس شہر کے باسی تو یرغمال بنا لیے گئے ہیں۔ مختلف سیاسی گروہوں نے شہر کے مختلف حصوں پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ سب۔۔۔ ہم سب قیدی ہیں۔ کوئی اپنی مرضی سے نہیں جی سکتا۔ جنگل کا قانون ہے یہاں۔۔"(۱۸)

ملک کے سب سے بڑے شہر میں انسانی اقدار کی سب سے زیادہ نفی پر مبین مرزا کی تشویش ترقی کے اس دور پر طمانچہ ہے کہ جس ترقی نے شہر کو بلند و بالا عمارتیں، نت نئی مشینیں، جدید طرزِ زندگی اور سہولیات تو دی ہیں لیکن انسان کی زندگی کو اس قدر ارزاں بنا دیا ہے کہ ایک فرد دوسرے فرد کے ہاتھوں ہی یرغمال بنا ہوا ہے۔ احساس کی دولت ختم ہو چکی ہے۔ در اصل مادہ پرستی اور معاشرے میں ایک دوسرے سے مسابقت کے جذبے نے انسان سے روزمرہ کا امن و سکون چھین لیا ہے اور انسان محض مشین بن کر رہ گیا ہے۔ اس ذیل میں حامد سراج کے افسانے "نصف مکمل" میں عصر حاضر کے انسان کا ایک عکس ملاحظہ ہو:

> "شہر کی برق رفتار مصروفیات سے وہ اوبھ گیا تھا۔ گاڑیاں سارا دن شاہراہوں پر بھاگ رہی ہیں، ان کے اندر بیٹھے ہوئے انسان اسے یوں محسوس ہوتا روبوٹ ہیں۔ سورج نکلنے پر ان کا بٹن دبا دیا جاتا ہے، وہ میکانکی انداز میں دن بھر چلتے رہتے ہیں، رات میں ان کا بٹن آف اور وہ بے دم ہو کر گر پڑتے ہیں۔"(۱۹)

درج بالا حوالے میں شہر کی برق رفتار زندگی کی بخوبی عکاسی کی گئی ہے۔ شہر میں انسان کی زندگی کسی روبورٹ کی مانند ہوتی ہے۔ انسان کے کام اور افعال گھڑی کی سوئیوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ جو شخص جتنی کامیابی سے گھڑی کی رفتار کے ساتھ بھاگ سکتا ہے وہ اتنا ہی کامیاب ٹھہرتا ہے اور اس کامیابی کے حصول میں اس کی زندگی سے فرصت کے وہ لمحات خارج ہو جاتے ہیں جو اس کے اندر کے انسان کی بالیدگی کے لیے ضروری ہیں۔ صارفیت نے انسان کے اندر مادی اشیاء کی خواہش اس قدر بھر دی ہے کہ اب انسان کے وجود میں سکوت اور سکون کشید کرنے کی بھی گنجائش نظر نہیں آتی۔ صارفیت کے اس عہد میں حامد سراج کے افسانے "سیاہ کار" میں انسان کی بے وقعتی کا عالم دیکھیں:

> "۔۔۔ اس آبادی کے مکینوں کو ایک دوسرے کی کوئی خبر نہیں۔ ہمسایہ ہمسائے سے بے خبر ہے۔ سورج کب نکلتا ہے اور کب غروب ہوتا ہے کسی کو خبر نہیں۔ یہاں صرف امارت کی چمک میں زندگی گزارنے کا چلن ہے۔"(۲۰)

درج بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہر کی بھاگ دوڑ نے انسان کو اس قدر مصروف کر رکھا ہے کہ اسے اپنے ہی ہم نفسوں کی کچھ خبر نہیں۔ انسان اپنے ہمسایے سے بے خبر ہے بلکہ اکثر اوقات تو اسے گھر کے افراد کے معاملات کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ بسنے والے انسان کے مسائل کیا ہیں۔ در اصل ہر انسان کے گرد ایک ایسا نہ نظر آنے والا ماد

ی حصار بندھ چکا ہے جو اسے دوسرے کی خبر لینے سے روکے رکھتا ہے۔ فطری زندگی میں مشینوں کی مداخلت نے انسان کی زندگی سے دوسرے انسانوں کے ساتھ روابط اور رشتوں کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ عصر حاضر کے اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں انسان کے اس مسئلے کو اجاگر کر کے قارئین کو راغب کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی طور اس مشینی عہد کے چنگل سے نکل کر فطرت کی طرف واپسی کا سفر شروع کر دیا جائے تو شاید انسان کی زندگی میں سکون اور اطمینان لوٹ آئے۔

عصر حاضر میں رہتے ہوئے ماضی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی صدی کے بہت سے تخلیقی رجحانات، تجربات اور انکشافات ختم ہو چکے ہیں یا اپنی اہمیت کھو رہے ہیں۔ اب نئی صدی کی ثقافتی عمارت کئی حوالوں سے پچھلی صدی سے مختلف ہے۔ نئی صدی کی تعبیرات اور تشریحات ماضی کی نسبت بہت حد تک تبدیل ہو چکی ہیں۔ انسان اپنی ذات میں اگرچہ فرد واحد ہے لیکن اس کی ذات معاشرے کی ایک ایسی اکائی ہے جو دیگر اکائیوں سے مل کر معاشرے کو بناتی ہے۔ ایک فرد معاشرے کے دوسرے افراد سے مل کر ایک ایسے ماحول سے جڑا ہوا ہے جس کے تناظر میں معاشرے کی ثقافت، رجحانات اور میلانات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انسان اور اس کے رویے تخلیقی ادب پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسانی آنکھ کے دیکھنے کا انداز ماحول کے مطابق بدلتا ہے اور اس طرح اس ماحول کے سیاق وسباق کی وضاحت کرتا ہے۔ ادیب کا قلم اور قلم کار دونوں ہی ان نظریات پر چلتے ہیں جو اس ماحولیاتی سیاق وسباق کے مرہونِ منت ہیں۔ یہی نظریات نئی ثقافتی تعبیرات کی تشکیل کرتے ہیں۔

جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا گیا اور ثقافت نے نئی کروٹ لینی شروع کی ویسے ویسے انسانی سرشت، شعور اور لاشعور اور جنسی ناآسودگیوں کے اسباب وعلل کو پرت در پرت کھولنے کا عمل تیز ہوا۔ مارکسی فکر کے دانشور، طبقاتی کشمکش، سماجی وثقافتی نفسیات و محرکات اور جدیدیت پسند انفرادی نفسیات، شعور کی رو، آزاد تلازمہ خیال پہ دھیان دینے لگے۔ ایک طرف مارکس، مارکسی دانشور، ترقی پسند تخلیق کار آن پہنچے تو دوسری طرف فرائڈ اور ژونگ، ایلیٹ، جوائس، لارنس، اور اردو دنیا کے جدیدیت پسند تخلیق کار اور نقاد کھڑے نظر آنے لگے۔ ان کے درمیان ایک اور فکر موجود ہے جس نے مارکس اور فرائڈ دونوں سے استفادہ کرتے ہوئے جنسی امتیازات کے مہلک اثرات کا محاکماتی جائزہ لیا۔ یہ نسائی اور تانیثی آواز ہے جس نے اردو افسانے کی کائنات کو فطری رنگوں سے مہمیز کیا۔ نسائی بیانیہ سے مراد وہ کہانی ہے جس میں عورت اپنی نظریاتی ثقافت کے پیراڈائم میں رہتے ہوئے اپنے حقوق اور فرائض کا ادراک پیش کرے جبکہ تانیثی بیانیہ کی عورت ان شرائط سے آزاد ہے۔ ہمارے سماج کی عورت ان دونوں صورتوں کے بیچ ایک تیسری صورت میں سامنے آتی ہے۔ وہ روایت اور جدت کے درمیان سفر کرتے ہوئے ایک ایسے بندھن کی خواہش کرتی ہے جس میں مرد وزن فاعل اور مفعول کی سماجی گرامر سے آزاد ہوں۔ عورت کے بدلتے ہوئے خیالات اور زندگی کے بارے میں بدلتے ہوئے نظریات اب اردو افسانے میں بھی نمایاں نظر آنے لگے ہیں۔ اس ضمن میں حامد سراج کے ہاں صارفی دور کی عورت کے خیالات ملاحظہ ہوں:

> "وہ دونوں کہیں ملازمت کرتے ہیں۔ عورت نے کہا، میں ایک پہیہ ہوں۔ اگر ایک پہیہ چلے، دوسرے سے کام نہ لیا جائے تو گاڑی نہیں چلتی، ڈولتی ہے اور بے ڈول نظر آتی ہے۔۔"(۲۱)

درج بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید معاشرے میں خواتین کا کردار بڑی حد تک تبدیل ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں قدیم معاشرے میں خواتین کا اصل میدان عمل ان کا گھر قرار دیا جاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ قدیم دیہاتی معاشرے میں خواتین کی بڑی تعداد زرعی مزدور کے طور پر کام کرتی رہی ہے۔ اس میدان میں بھی ان کی معیشت مرد کے تابع ہی رہی ہے اور ان کا معاوضہ بالعموم ان

کے خاوند ہی وصول کرتے رہے ہیں۔ وقت بدلنے لگا تو خواتین کی بڑی تعداد نے صنعت و تجارت کی طرف رخ کیا۔ مختلف سرکاری و غیر سرکاری ملازمتوں میں ان کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ سیاسی میدان میں خواتین اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ یہ تمام شواہد معاشرے میں عورت کے بدلتے ہوئے کردار کا تعین کرتے ہیں۔ اس تناظر میں افسانہ "جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی" میں عورت کے ہاں فکرِ معاش کے بدلتے ہوئے رویے کو ان سطور میں محسوس کیا جاسکتا ہے:

> "۔۔۔اس کی بیوی کو گھر کے اخراجات اڑانے کے لیے چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرنی پڑیں۔ شراب خانے کی ویٹریس بننے سے لے کر پرچون کی دکان پر کلرکی تک کو ان کاموں میں شامل کر لیجیے۔"(۲۲)

دراصل عورتیں غمِ روزگار کے ہاتھوں جبر اور استحصال کا شکار ہیں۔ یہ ایک تلخ سچ ہے۔ ہمارے معاشرے میں چند عشرے پیشتر خواتین کے نوکری اختیار کرنے کو غیر ضروری بلکہ معیوب سمجھا جاتا تھا۔ گھریلو عورت ہونا اور گھر گرہستی کے امور تک محدود رہنا معمول تھا اور باعثِ شرم ہرگز نہ تھا۔ وقت اور حالات نے بتدریج کروٹ بدلی، معیارِ زندگی اور حقوقِ نسواں کے تصوّرات کو فروغ ملا جس کے نتیجے میں عورت نے عملی زندگی، معاش اور معاشرتی مقام کو اپنے روایتی کردار پر واضح فوقیت دینا چاہی۔ مردوں کے نظریات بھی بدلنے لگے۔ پھر کارپوریٹ کلچر نے بھی معاشرے کا روایتی فکری انداز بدل دیا اور خاندان کی بڑی بوڑھی عورتوں نے بہو بیٹی کی ڈگری اور تنخواہ کو خاندان میں عزت کے معیار کے طور پر رائج کر دیا۔۔۔یہ سارے بوجھ اعصاب پر اٹھائے تعلیم یافتہ لڑکی پہلے روائتی اور موزوں روزگار کے امکانات تلاش کرتی رہتی ہے اور پھر کسی کمزور لمحے میں کسی مشکل فیصلے پر پہنچ کر اپنے لیے کام ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ عملی کام کے میدان میں عورت کو کئی مسائل کا سامنا ہے جن میں سرِ فہرست عورت کے مشتہر ہونے کا معاملہ ہے۔ پیشہ ورانہ دنیا نے عورت سے اس کا ستر چھین لیا ہے۔ اس ضمن میں صارفیت کی بدولت عورت کے مناصب میں واقع ہونے والی تبدیلی کو رفاقت حسین کے افسانے "چریا ملک" کے اس اقتباس میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے:

> "جب ٹانگ پر گولیاں لگیں تو۔۔۔خون بہنے سے میں بے ہوش ہو گیا۔۔۔جب ہوش میں آیا تو بالکل ننگا تھا۔ الف ننگا۔ دو نرسیں پاس کھڑی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔میں وہاں جتنے دن رہا انہوں نے میری شیو بنائی، کپڑے بدلوائے اور نہلایا بھی۔"(۲۳)

دراصل یہ سب معاملات حقوقِ نسواں کی تحریک کے ثمرات ہیں۔ اس تحریک میں عورت کے حق میں جس چیز کا مطالبہ سب سے زیادہ کیا گیا ہے وہ اس کا ذاتی طور پر خود مختار ہونا اور مالی طور پر مستحکم ہونا ہے۔ بدلتے ہوئے معاشرے میں ڈگری اور نوکری عورت کے لیے لازمی ہیں اور حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ اس کے رشتے میں بندھنے کی ضروری شرائط ہیں۔ ملازمت اور ترقی کے امکانات حقیقی معنوں میں ہمیشہ محدود ہی ہوتے ہیں۔ ہمارا نظام تمام ڈگری یافتگان کو محفوظ مستقبل یا مستقل روزگار کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ لاکھوں اعلیٰ تعلیم یافتہ بے روزگار لڑکیاں اچھے رشتوں کی بنیادی شرائط پوری کرنے کے لیے گھر کی دہلیز سے قدم باہر نکالتے ہی جس پیشہ ورانہ ماحول میں قدم رکھتی ہیں اس کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ کسی منڈی میں داخل ہو رہی ہیں جہاں ان کی قیمت ان کی قابلیت سے زیادہ ان کے ظاہری وجود کی بنا پر لگائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں محمد حمید شاہد کے افسانے "جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی" سے عورت کی نمائشی حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

"یہ عورت کا بالعموم وتیرہ ہوا کرتا ہے کہ وہ دیکھی جائے۔ ہمارے اپنے افسانہ نگاروں نے عورت کے دکھنے کی خواہش اور مرد کی دیکھنے کی اشتہا اور نظر بازی کی عادت کو ایک ساتھ رکھ کر کئی ایک کہانیاں لکھ لی ہیں۔ کبھی کبھار تو لگتا ہے بس ہمارے ہاں اس ایک تجربے کو ہی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عورت بن سنور کر نکلتی ہے دکھنے کے لیے اور مرد اس کے تعاقب میں ہوتا ہے نظر بھر کر دیکھنے کے لیے۔"(۲۴)

درج بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عورت کی نمود و نمائش ایک طرف اس کی پیشہ ورانہ ضرورت بن چکی ہے تو دوسری طرف مرد نے بھی اسے ایسے ہی روپ میں متصور کرنا شروع کر دیا ہے اس لیے اس ذیل میں فقط عورت کو قصوروار ٹھہرانا مناسب نہیں بلکہ مرد بھی عورت کی اس نئی گھڑت میں برابر کا شریک ہے۔ عورت کو جس منڈی میں لا کھڑا کرنے میں مرد کی پوری پوری معاونت ہے اس میں ایک منڈی سوشل میڈیا بھی ہے۔ سوشل میڈیا میں چونکہ ہر طرح کے جذبات کے اظہار کی آزادی ہے، اس لیے کہیں جسم کی نمائش کرنے والی عورتوں کی توصیف ہو رہی ہوتی ہے اور کہیں انہیں طوائف، جسم بیچنے والی اور حرّافہ وغیرہ کہہ کر پکارا جا رہا ہوتا ہے۔ اس دوغلے پن، دوہرے معیارات اور لوگوں کی آپس میں لڑائی نے دنیا بھر کی خواتین کی نفسیاتی اور ذہنی صحت پر بدترین اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان میں اضطراب، کم لباسی پر شرم، بھوک کی کمی، اپنے آپ میں عزتِ نفس کی کمی اور ڈپریشن جیسے بے شمار امراض پیدا ہو چکے ہیں۔ خوبصورت جسموں کو آئیڈیل اور ماڈل کے طور پر پیش کیا جانا، عورتوں میں خطرناک ڈپریشن پیدا کر رہا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ صارفیت، عالمگیریت، ثقافتی یلغار اور جدید طرزِ زندگی نے معاشرے میں عورت کو ایسا ہی بکاؤ مال بنا ڈالا ہے جو قبل اسلام معاشروں میں رائج تھا۔ صارفی معاشرت میں عورت کی منزلت کا تعین مبین مرزا کے افسانے "گم شدہ لوگ" کے رئیس کے خرچنے کے انداز سے خوب ظاہر ہے:

"وہ انتظار کر رہی تھی کہ رئیس اٹھ کر بیڈ پر آ جائے لیکن رئیس ٹی وی میں مصروف تھا۔ عجیب آدمی ہے یہ۔ اس نے سوچا۔ اتنے پیسے خرچ کرتا ہے۔۔ جہاز کا کرایہ، اس گیسٹ ہاؤس کا بل، انجلی کے لیے قیمتی تحفے۔۔ یہ سب کچھ صرف ایک بار کی قربت کی قیمت ہے۔"(۲۵)

درج بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں عصمت فروشی ایک باقاعدہ صنعت کا درجہ رکھتی ہے۔ کچھ ممالک میں اسے قانونی تحفظ بھی حاصل ہے۔ مذہب کی غیر واضح تعریف، پسماندہ ممالک کا ترقی یافتہ ممالک پر انحصار اور سرمایہ دارانہ نظام کی کامیابی نے نچلے طبقے کے ممالک میں عورت کی اس قدر و منزلت کو نہ صرف از خود جائز قرار دے دیا ہے بلکہ اس کے فروغ کے لیے بھی باقاعدہ کوشش کی جاتی ہے۔ یہ چلن بھی پسماندہ ممالک نے سرمایہ دارانہ ممالک سے ہی اپنایا ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام بظاہر عصمت فروشی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن اسے تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف منافع بخش کاروبار ہونا ہی ہے۔ چونکہ سرمایہ داری منافع خوری کا نام ہے چنانچہ ایسا کاروبار جو منافع بخش ہو، اسے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے کا سب سے کریہہ پہلو یہ بھی ٹھہرا ہے کہ غربت اور مفلسی کے شکار ممالک سے عورتوں اور لڑکیوں کو اسمگلنگ کر کے مغربی اور امریکی ممالک میں لے جایا جاتا اور وہاں جنسی غلامی کے طور پر بے جان سامان کی طرح انہیں بازاروں میں فروخت کیا جاتا ہے اور جنسی ہوس پرست یا دولت کے پجاری ان عورتوں کی خریداری کر کے یا اپنے استعمال میں لاتے ہیں یا ان سے جنسی افعال کا ارتکاب کروا کر ان کی ویڈیوز کو

مجازی دنیا میں پھیلا کر پیسہ کماتے ہیں۔ صارفی عہد میں عورت کا جسم اشتہار کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ اس ذیل میں صارفی معاشرے میں عورت کی نمود کا اظہار محمد حمید شاہد کے افسانے "آدمی کا بکھراؤ" کے اس اقتباس میں بخوبی ہوتا ہے:

> "کامران ریموٹ ہاتھ میں لیے ٹیلی وژن کے چینل بدلتا رہتا۔ کبھی تو وہ اتنی تیزی سے چینل بدلتا کہ پورا بیڈ روم پلکیں جھپکتا ہوا محسوس ہوتا۔ ایسے میں اس کا ہاتھ ان ہاٹ چینلز پر بھی نہ رکتا جو ایک عرصہ تک اسے بہت مرغوب رہے تھے، ننگی رانیں اور کھلے سینے دکھانے والے ان چینلز کو دیکھتے دیکھتے وہ فائزہ سے اوب گیا تھا۔۔"(۲۶)

درج بالا حوالے کو مدنظر رکھیں تو عورت کی اشتہاری حیثیت کا خوب تعین ہوتا ہے۔ جدید اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں ان موضوعات کو اجاگر کر کے معاشرے میں عورت کے موجودہ مقام کا تعین کرتے ہوئے عورت کے وقار کی بحالی کی کوششیں شروع کی ہیں جو لائقِ تحسین ہیں۔ دراصل عورت کو ہم آج کی سماجی دنیا سے الگ رکھ کر تہذیبی، مالی، سیاسی اور ثقافتی ترقی نہیں کر سکتے۔ فی الواقع اس امر کی ضرورت ہے کہ عورت کو قانونی تحفظ دیا جائے تاکہ وہ اپنی مرضی کا بلاخوف وخطر اور آزادانہ استعمال کرے۔ اس حقیقت کو ماننے کی ضرورت ہے کہ عورت سماج کی انتہائی ذمے دار اکائی ہے اور نئی نسل کا شجر برگ وگل ہے سو اس کی تکریم لازم ہے۔ نئے افسانہ نگاروں نے اس ضمن میں اپنی کہانی کے کرداروں کے ذریعے عورت کی معاشرتی حیثیت اور وقار کو بلند کرنے کے لیے جدید ادب تخلیق کیا ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس کے ذریعے عورت کا معاشرتی مقام بھلے ایک دم سے بلند نہیں ہو سکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ ادب کے قارئین کے اذہان میں اس سلسلے کی بنا ضرور پڑ چکی ہے۔ اس تمام بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو افسانہ جمود کا شکار نہیں اور اس میں وہی روایتی موضوعات ہی جگہ نہیں پاتے بلکہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات بھی افسانے میں زیرِ بحث لائے جاتے ہیں۔ صارفیت ایک پیچیدہ و نادیدہ تصور ہے لیکن عصرِ حاضر کے افسانہ نگاروں نے اپنے کرداروں کے توسط سے اس کی اس طرح توضیح کی ہے کہ جس کی وجہ سے قاری اس کے مضمرات سے بخوبی آگاہ ہو سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، بک کارنر، جہلم۔ ۲۰۱۵ء، ص:۳۲

۲۔ حامد سراج، بخیہ گری، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۳ء، ص:۱۳۱

۳۔ حامد سراج، بخیہ گری، ص:۱۰۷

۴۔ حامد سراج، وقت کی فصیل، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، طبع دوم، ص:۲۵

۵۔ حامد سراج، بخیہ گری، ص:۱۳۱-۱۳۲

۶۔ محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، ص:۱۳۳

۷۔ مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص:۳۱

8. https://www.rekhta.org/stories/parchhaiin-rafaaqat-hayaat-stories

9. https://www.rekhta.org/stories/gulaan-ki-sargoshiyan-rifaaqat-hayaat-manto

۱۰۔ حامد سراج، برائے فروخت، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، طبع دوم، ص:۳۳

۱۱۔ حامد سراج، بخیہ گری، ص:۱۳۱

۱۲۔ حامد سراج، وقت کی فصیل، ص:۹۲

13. https://www.rekhta.org/stories/indoneshi-ciggrate-rafaaqat-hayaat-stories

۱۴۔ محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، ص:۹۷

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۳۴

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۳۶-۱۳۷

۱۷۔ مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، ص:۴۲

۱۸۔ ایضاً، ص:۶۷

۱۹۔ حامد سراج، بخیہ گری، ص:۹۷

۲۰۔ ایضاً، ص:۱۳۲

۲۱۔ ایضاً، ص:۱۳۲

۲۲۔ محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، ص:۷۲

23. https://www.rekhta.org/stories/chirya-mulk-rafaaqat-hayaat-stories

۲۴۔ محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، ص:۷۲

۲۵۔ مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، ص:۳۳

۲۶۔ محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، ص:۱۳۷

References in Roman Script:

1. Muhammad Hamid Shahid, Dahshat Mein Mohabbat, Book Corner, Jhelum, 2015, p: 32

2. Hamid Siraj, Bakhiyah Gari, Al-Fateh Publications, Rawalpindi, 2013, p: 131

3. Hamid Siraj, Bakhiyah Gari, p:107

4. Hamid Siraj, Waqt Ki Fasil, Porab Academy, Islamabad, 2009, 2nd ed., p. 25

5. Hamid Siraj, Bakhiyah Gari, p: 131-132

6. Muhammad Hamid Shahid, Dahshat Mein Mohabbat, p: 133

7. Mubeen Mirza, Khauf Ke Aasman Tale, Academy Baziyaft, Karachi, 2004, p: 31

8. https://www.rekhta.org/stories/parchhaiin-rafaaqat-hayaat-stories

9. https://www.rekhta.org/stories/gulaan-ki-sargoshiyan-rifaaqat-hayaat-manto

10. Hamid Siraj, Baraye Farokht, Porab Academy, Islamabad, 2009, 2nd ed., p: 33

11. Hamid Siraj, Bakhiyah Gari, p:131

12. Hamid Siraj, Waqt Ki Fasil, p: 92

13. https://www.rekhta.org/stories/indoneshi-ciggrate-rafaaqat-hayaat-stories

14. Muhammad Hamid Shahid, Dahshat Mein Mohabbat, p: 97
15. Ibid, p: 134
16. Ibid, p: 136-137
17. Mubeen Mirza, Khauf Ke Aasman Tale, p: 42
18. Ibid, p: 67
19. Hamid Siraj, Bakhiyah Gari, p: 79
20. Ibid, p:132
21. Ibid, p:132
22. Muhammad Hamid Shahid, Dahshat Mein Mohabbat, p: 72
23. https://www.rekhta.org/stories/chirya-mulk-rafaaqat-hayaat-stories
24. Muhammad Hamid Shahid, Dahshat Mein Mohabbat, p:72
25. Mubeen Mirza, Khauf Ke Aasman Tale, p:33
26. Muhammad Hamid Shahid, Dahshat Mein Mohabbat, p:137